Fikr-o-Nasar (Islamabad) 14:3-4 (1976) © rasailojaraid.com

اظہارِ رائے کی آزادی

اور

مسلم سوسائٹی

رشید احمد (جالندھری)

کہا جاتا ہے کہ مغرب نے اظہارِ رائے کا حق منوانے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے اور ایک طویل اور پرمشقت سفر کے بعد یورپ نے یہ مقام حاصل کیا ہے کہ کوئی آدمی مذہب یا سیاست میں اختلافِ رائے کی بناء پر کلیسا یا ریاست کے جارحانہ رویے کا شکار نہیں بنتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس حق کو منوانے کے لیے جو قربانیاں دی گئیں ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ سچائی کسی ایک فرد یا جماعت کی جاگیر نہیں۔ اس کی تلاش کے لیے جو بھی تگ و دو کرنا چاہے کر سکتا ہے چنانچہ حق اور سچائی کی تلاش کے لیے آزادانہ طور پر غور و فکر اور بحث و مذاکرے کو ضروری قرار دیا گیا۔ ملٹن نے نئے عہد کی فکری بے تابی کو اپنے خاص انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا تھا:۔

> "مجھے ضمیر کے مطابق معلومات حاصل کرنے اور بے باکانہ طور پر خیالات کے اظہار اور بحث کی آزادی چاہیے۔"

> "Give me the liberty to know, to utter and to argue freely according to conscience".

اس حق کو منوانے کے بعد یورپ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نئے دور نے پوری دنیا کو جس انداز سے متاثر کیا۔ وہ محتاجِ بیان نہیں۔ چرچل نے نئے دور کو "to enquire, to debate and seek new explanations" کا نام دینے کے بعد لکھا کہ نئے دور نے یہ بتا دیا تھا کہ یورپ کا [illegible] سے [illegible] منتقل ہو رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم یہاں اس امر پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ اعتقاد و مذہب کی آزادی اور اظہار رائے کے بارے میں خود ہماری اپنی روایات کیا ہیں اور آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ وقت کی کوئی بھی طاقت انسان کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے خیالات پر پابندی نہیں لگا سکتی۔ زندگی اور اس کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آدمی کے دماغ میں سوچ بچار کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس سوچ بچار پر پابندی لگانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن آدمی کے سامنے زندگی کی سب سے بڑی مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب وہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے اور اپنے افکار کے اظہار کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ سوسائٹی بسا اوقات ان خیالات کی متحمل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ انہیں اپنے قوانین اور رسم و رواج کے خلاف تصور کرتی ہے۔ چنانچہ سوسائٹی ان خیالات کو دبانے کی پوری کوشش کرتی ہے اور انسان پر یہ پابندیاں عائد کرتی ہے کہ وہ یا تو اپنے خیالات سے دست بردار ہو جائے اور چپ رہے یا پھر اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار رہے۔

چنانچہ جو لوگ فطرت سے غیر معمولی دل و دماغ اور بلند کردار لے کر آتے ہیں وہ وقت کے مزاج کا خیال کیے بغیر اپنی سوسائٹی، قوم اور ملت کو اپنے افکار سے آگاہ کرتے ہیں۔ اور اس راہ میں آنے والی ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ انہی اولوالعزم انسانوں کے نعرہ ہائے آزادی سے موجودہ انسان کو یہ حق ملا ہے کہ وہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں بے خوف و خطر اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔ یونان کے مایہ ناز فلسفی سقراط پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ نوجوانوں کے خیالات کو بگاڑ رہا ہے۔ اس لیے اسے تعلیم سے دست بردار ہو جانا چاہیئے یا پھر سزا بھگتنے کے لیے تیار! لیکن ستر سالہ بوڑھے سقراط نے وہی راہ اختیار کی جو بلند کردار انسانوں کی راہ ہے۔ سقراط نے عدالت سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ نیکی روپے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ نیکی سے روپیہ اور ہر وہ چیز جو انسانوں کے لیے اچھی ہے خواہ وہ ذاتی ہو یا عمومی، حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہے میری تعلیم۔ اگر یہ تعلیم نوجوانوں کو بگاڑتی ہے تو واقعی میں فتنہ پرداز آدمی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ اہل ایتھنز! میں تم سے یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ تم مجھے رہا کرو یا نہ کرو جو بھی صورت اختیار کرو لیکن یہ جان لو کہ میں ہرگز اپنی راہوں کو بدلنے والا نہیں ہوں خواہ مجھے اس کے لیے بار بار جان دینی پڑے۔۔۔۔۔۔۔۔ اے اہل ایتھنز! میں یہ بحث اپنے لئے نہیں کر رہا ہوں جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ بلکہ صرف تمہاری خاطر، تاکہ تم مجھ کو جو تمہارے لیے عطیہ خداوندی ہے سزا دے کر گنہ گار نہ ہو کیونکہ اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو تمہیں میرا کوئی جانشین آسانی سے نہ ملے گا۔"

سقراط کے بعد ہر دور میں [illegible] آواز کو منظم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ سنی گئی۔ رسول کریم کی آواز کو آپ کے مخالف طاقت کے بل پر دبانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں طرح طرح کے جتن کئے گئے آخر میں یہ مخالفین رسول کریم کے چچا ابوطالب کے پاس پہنچے۔ ابوطالب نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ازراہ تلطف رسول کریم سے کہا: مجھ پر اور اپنے پر رحم کیجئے اور مجھ پر اس سلسلہ میں میری بساط سے زیادہ بوجھ نہ ڈالیے۔" رسول کریم نے جواب میں فرمایا: "چچا جان! بخدا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج رکھ دیں اور بائیں ہاتھ پر چاند، تاکہ میں اس دعوت کو چھوڑ دوں، میں اسے ترک نہیں کروں گا۔ تا آنکہ خدا اس دعوت کا بول بلند کر دے یا میں اس راہ میں جان دے دوں۔"

ان مثالوں سے یہ بتانا مقصود ہے کہ صاحب عزم انسانوں اور اولوالعزم پیغمبروں نے کبھی بھی اظہار رائے کے حق سے دست بردار ہونا گوارا نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج انسانی تاریخ کا کوئی صفحہ بھی روشن نہ ہوتا۔ اس حق کو منوانے کے لیے تاریخ کے ہر عہد اور دور میں لوگوں نے جدوجہد کی ہے۔ رومن شہنشاہیت میں تین صدیوں تک عیسائی باشندوں کو صرف اس لیے ظلم کا نشانہ بننا پڑا کہ وہ وقت کے رائج مذہبی افکار سے الگ عقیدہ رکھتے تھے بالآخر رومی مملکت نے مذہب میں اختلاف رائے کے حق کو تسلیم کر لیا۔ اور چوتھی صدی عیسوی میں (۳۱۳ء) مذہبی آزادی کے بارے میں یہ فرمان جاری کیا:۔

"ہم عیسائیوں کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے انفرادی خیالات کا اقرار کر سکیں اور وہ بغیر کسی خوف و ہراس کے عبادت کے لیے جمع ہو سکتے ہیں، لیکن انہیں قانون اور حکومت کی حرمت کا ہر وقت خیال رکھنا ہوگا۔"

مغرب میں مذہب اور عقیدے کے بارے میں اظہار رائے کا شاید یہ سب سے پہلا سرکاری فرمان ہے، مشرق میں مذہبی آزادی کا اعلان مہاراجہ اشوک نے کیا، اشوک نے اس تاریخی اعلان میں کہا:۔

"بادشاہ جو خدا کا محبوب ہے ہر مذہبی عقیدے کو آزادی کا شرف بخشتا ہے بادشاہ کی یہ رائے ہے کہ مذہبی روح کے فروغ سے بڑھ کر کوئی دوسرا شرف یا عطیہ نہیں۔ مذہب کی بنیادی روح یہ ہے کہ آدمی اپنے عقیدے کا احترام کرے لیکن دوسرے کے مذہب سے نفرت بھی نہ کرے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی تاریخ میں یہ دونوں اعلان تاریخ کے دو غیر معمولی واقعات ہیں، لیکن افسوس کہ انسان جوں جوں مذہب کی سچی روح سے دور ہٹتا گیا وہ انسان کے لیے مذہب ہی کے نام پر ان گنت مصیبتوں کا سروسامان جٹاتا [illegible] حق کو [illegible] کر حاصل کیا تھا۔ اسی حق کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عیسائیت نے اقتدار میں آنے کے بعد پاؤں تلے روندا اور ہر شہری سے مذہبی آزادی کا حق چھینا، چنانچہ عقیدے کی آزادی کا تصور مذہبی حلقوں میں گناہ تصور کیا جانے لگا۔

ان دونوں تاریخی اعلانات کے بعد اسلام سب سے پہلا دین ہے جس نے صاف اور واشگاف لفظوں میں نہ صرف عقیدے کی آزادی کا اعلان کیا بلکہ اس آزادی کو اپنے عقیدے کا ایک حصہ قرار دیا۔ اسلام نے عقیدے کی آزادی کا اعلان کسی سیاسی مفاد یا خارجی دباؤ کی وجہ سے نہیں کیا چونکہ یہ حق ایک خدائی عطیہ ہے جو انسان سے چھین لیا گیا تھا۔ اسلام نے انسان کو اس کا کھویا ہوا حق واپس دلایا چنانچہ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں آزادی کا تصور کیا ہے اور مسلم معاشرے میں اس کا کہاں تک تجربہ کیا گیا؟ مسلمانوں میں آزادی کے تصور کے بارے میں یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ وہ بنیادی طور پر اس تصور سے نہ صرف واقف تھے بلکہ انہیں اس بات کا بڑی شدت سے احساس تھا۔ "حر" یعنی آزاد آدمی کا تصور قرآن مجید میں آیا ہے۔ قرآن مجید نے آزاد آدمی کا ذکر غلام کے مقابلہ میں کیا ہے۔ آزاد آدمی وہ ہے جو اپنے معاملات کو سلجھانے میں خود مختار ہو ایسے ہی آزاد آدمی کا اطلاق اس آدمی پر بھی ہوتا ہے جو دنیاوی امور سے آزاد ہو کر خدائی عبادت کے لیے وقف ہو جائے۔ حضرت مریم کی ماں نے نذر مانی تھی کہ اگر ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ اسے ہیکل کی نذر کریں گی۔ اس نذر کو قرآن مجید نے "محررًا" سے تعبیر کیا ہے گویا کہ ہیکل کی غلامی ان کے نزدیک آزادی تھی۔

یہود اور نصاریٰ کے بارے میں مسلمانوں نے جو فیاضانہ سلوک روا رکھا تو یہ کوئی ان پر احسان نہیں تھا اگر مسلمان ایسا نہ کرتے تو وہ یقیناً اپنے عقیدے اور اسلامی تعلیمات سے انحراف کرتے۔ قرآن مجید نے عقیدے کی آزادی کے بارے میں فرمایا ہے کہ دین کے بارے میں کسی پر کوئی جبر نہیں۔

آزاد آدمی سے وہ آدمی بھی مراد لیا جاتا تھا جو بری عادتوں سے پاک صاف ہو۔ مثلاً حسد، جھوٹ، مکر و فریب اور اس قسم کے دوسرے رذائل سے۔ عرب شاعری میں شریف اور راست باز آدمی کے لیے بھی لفظ "حر" آیا ہے مثلاً

فلا عار ان زالت عن الحر نعمةً — ولكن العار ان يزول التجمّل

اگر ایک شریف آدمی کے پاس مال و دولت نہ رہے تو اس میں کوئی عار نہیں البتہ ننگ کی بات یہ ہے کہ مروت اور بہادری آدمی کا ساتھ چھوڑ دے یہی وجہ ہے کہ ایک بدکردار آدمی پر "حر" یعنی آزاد آدمی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ خواہ یہ آدمی اجتماعی طور پر آزاد ہی تصور کیوں نہ کیا جاتا ہو۔ ایک دفعہ چند خواتین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں آپ نے ان سے جن بری باتوں سے بچنے کا عہد لیا ان میں سے ایک زنا بھی تھا اس پر ہندہ نے کہا کہ کیا کوئی آزاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاتون (حرّہ) یہ کام کر سکتی ہے۔ (اذ ترنی الحرّو) گویا کہ ہندو نے آزادی اور شرافتِ نفس کو لازم و ملزوم قرار دیا

یہ عجیب حسنِ توارد ہے کہ ہندو کے انہی خیالات کو ایک انگریز فلسفی نے یوں ادا کیا ہے :-

"And hence it is said with truth that none but a person of confirmed virtue is completely free".

بہرکیف "حریت" یا آزادی کو مسلمان عطیہ خداوندی تصور کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسائل میں بھی آزادی سے بات چیت کرتے تھے اور اپنی رائے کے اظہار میں مطلقاً نہیں جھجکتے تھے۔ مثلاً جنگِ اُحد میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ممتاز صحابہ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ ہی میں رہ کر دفاع کیا جائے، ورنہ شکست کا ڈر ہے لیکن ساتھیوں کی اکثریت کی رائے اس کے حق میں نہ تھی۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر تشریف لے آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ جنگ کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ دفاع کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ممتاز صحابہؓ کی رائے ہی درست تھی لیکن رسول کریمؐ نے جنگ کے بعد اپنے کسی ساتھی سے یہ نہیں فرمایا کہ تمہاری وجہ سے جنگ کا فیصلہ ہمارے حق میں نہیں ہوا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے دو باتوں کا صاف طور پر پتہ چلتا ہے :-

(۱) مسلمان سیاسی اور اجتماعی امور میں آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے لیکن جن باتوں میں وحیِ الٰہی نے کوئی فیصلہ دیا ہو، وہ آخری فیصلہ شمار ہوتا تھا۔

(۲) عقیدے میں آدمی کی رائے کا احترام کیا گیا۔ چنانچہ نصاریٰ اور یہود اپنے عقیدے پر قائم رہے اور اپنی مذہبی رسومات کو آزادی کے ساتھ بجا لاتے رہے۔

اس دعوے میں شاید کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ مذہب کی تاریخ میں اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کو عقیدے اور اظہارِ رائے کی آزادی دی۔ یہ درست ہے کہ رومن امپائر اور اشوک نے اس آزادی کو تسلیم کیا جیسا کہ پہلے کہا گیا لیکن یہ دونوں تاریخی قدم اس دور کے حالات سے مجبور ہو کر اٹھائے گئے تھے تاکہ مزید خون ریزی کو روکا جا سکے لیکن اسلام نے یہ اعلان خارجی عوامل کے دباؤ کے نتیجہ میں نہیں کیا۔

ایک طرف اسلام نے عقیدے اور مذہب کی آزادی کا اعلان کیا۔ دوسری طرف رسول کریمؐ نے غیر مسلموں کو اجتماعی اور سیاسی طور پر برابری کے حقوق دیئے۔ ان سیاسی حقوق کا اعلان اس تاریخی معاہدے میں کیا گیا

جو رسول کریمؐ نے مدینہ پہنچ کر اہلِ مدینہ یعنی مہاجرین، انصار اور یہودیوں کے مابین طے کرایا۔ پیغمبروں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسولوں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ کے مختلف عہد میں بعض پیغمبر زماں روا بھی ہوئے ہیں لیکن آج ہمارے پاس ان کی کوئی سیاسی دستاویز اپنی اصل شکل و صورت میں موجود نہیں ہے مدینہ کا معاہدہ جو ایک خالص سیاسی معاہدہ ہے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے اس معاہدے میں جو مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین ہوا یہ طے پایا۔

۱۔ پیغمبر اسلام نے مدینہ منورہ کی جو شہری ریاست بنائی ہے، مسلمان اور یہودی دونوں اس کے شہری ہیں۔

۲۔ دونوں مدینہ منورہ کی پاک اور مقدس سرزمین کا مشترکہ دفاع کریں گے۔

۳۔ دونوں فریق کو مکمل طور پر اپنے اپنے مذہب کی آزادی حاصل ہوگی۔

یہاں پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسلام سے پہلے عرب سوسائٹی کا یہ رواج تھا کہ اگر یہودی یا کھیتی باڑی کرنے والا عرب شہری قتل ہو جاتا تو اس کا خون بہا صحرا نشین زندگی بسر کرنے والے عرب سے کم ہوتا۔ لیکن رسول کریمؐ نے اپنے سیاسی معاہدے پر یہودیوں کے سیاسی مرتبہ کو مسلمانوں کے برابر قرار دیا۔

بہر نوع اسلام نے نظریاتی طور پر اور بعد میں مسلم معاشرے نے عملی طور پر اس اصول کو تسلیم کیا کہ مسلم ریاست کے ہر شہری کو مذہبی اور سیاسی آزادی حاصل ہوگی اور ہر آدمی قانون کے دائرے میں رہتا ہوا اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے اسلام میں آزادانہ غور و فکر کی قدر و منزلت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم محققین نے ایمان کی بنیاد علم پر رکھی ہے۔ تقلید پر مبنی ایمان کو بعض علماء کرام نے ایمان شمار نہیں کیا ہے۔

یہاں پر اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ عیسائی یا یہودی جب مسلم ریاست کے شہری بنے تو انہیں "احرار" کے نام سے یاد کیا گیا۔ فقہاء نے ٹیکس کی بحث کرتے وقت انہیں آزاد شہریوں کی صف میں شمار کیا اور انہیں مسلم ریاست کا "غلام" تصور نہیں کیا گیا۔ آج مغرب کی تاریخ نے ابتدا ایسے ہی یہودیوں کی تاریخ نے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا کہ عہد حاضر میں یورپ میں جب کبھی یہودیوں کو ستایا گیا تو انہوں نے مسلم ممالک میں پناہ لی حتےٰ کہ دوسری عالمگیر جنگ میں مشرقی یورپ کے یہودیوں نے جیسا کہ پولینڈ کے ایک یہودی نے نازی لیڈر شپ کے مقدمہ میں کہا ہے جدید ترکی میں پناہ لی تھی۔ تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے جن یہودیوں کو مسلمانوں نے ہمیشہ پناہ دی تھی آج انہی کے ہاتھوں مسلمانوں کو ان گنت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ؎

مدار روزگارِ سفلہ پرور را تماشہ کن

یہ تو تھا مسلمانوں کا غیر مسلم شہریوں کے ساتھ سلوک۔ لیکن خود مسلمانوں کا آپس میں کیا تعلق تھا یعنی انھوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کس حد تک خود اپنی جماعت میں اظہارِ رائے کے حق کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کا ذکر ہو چکا کہ وہاں اختلافِ رائے اور اس کا اظہار عام طور پر کیا جاتا تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی اس اصول کو عملی طور پر نافذ کیا گیا چنانچہ خلفائے راشدین کا انتخاب باہمی مشاورت سے کیا گیا خواہ اس مشاورت کا دائرہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو۔ انتخاب اور شوریٰ کا تصوّر خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہاں اختلافِ رائے اور اس کے اظہار کی اجازت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بعض لوگوں کو اظہارِ رائے سے روکا گیا۔ مثلاً یہ کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابُوذر غفاریؓ کو اختلافِ رائے کی بنا پر مدینہ سے باہر ربذہ میں نظر بند کر دیا تھا یا اس قسم کے دوسرے واقعات جنھیں حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری تاریخی کتابوں نے ان واقعات کو جس انداز سے نقل کیا ہے ان میں تضاد پایا جاتا ہے جس کی کسی طرح پر کوئی توجیہہ ممکن نہیں، مثلاً ایک طرف یہ دعوےٰ ہے کہ خلافتِ راشدہ میں شورائی نظام تھا یعنی مشورہ کے بغیر خلیفۂ وقت کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے گورنروں کے تقرّر اور مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت اپنے رشتہ داروں کو سامنے رکھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضرت عثمانؓ نے یہ قدم مجلس شوریٰ کے مشورے سے اٹھائے تھے تو پھر ان پر اقربا نوازی کا الزام بے معنی ہے اگر ایسا نہیں کیا گیا تو پھر شورائی حکومت کا دعوےٰ محلِ نظر ہے۔ افسوس کہ اردو میں لکھنے والے بعض حضرات نے ان تاریخی واقعات کو نوشتۂ آسمانی قرار دیکر حضرت عثمانؓ پر الزامات کی ایک فہرست گِنوا دی لیکن انھیں یہ خیال نہ رہا کہ وہ اس طرح سے اپنے ہی دعویٰ کی کہ خلافتِ راشدہ شورائی نظام تھا تردید کر رہے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اسلام نے بنیادی طور پر سیاست میں مشورے کا حکم دیا جسے رسولِ کریمؐ کے عہد میں عملی طور پر اپنایا بھی گیا لیکن شوریٰ ایک موثر اور پائیدار ادارہ کی حیثیت اختیار نہیں کر پایا۔ اگر حضرت عمرؓ چند سال اور زندہ رہ جاتے تو وہ یقیناً دستور، شوریٰ اور طریقِ انتخاب سے متعلق امور کو منظم فرما جاتے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے چھ رکنی کمیٹی بنائی گئی لیکن ان چھ ارکان کا تعلق قریش سے تھا ان میں انصار کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ حالانکہ خلیفہ کا انتخاب قریش کے لیے نہیں بلکہ سارے مسلمانوں کے لیے کیا جا رہا تھا۔ اس قسم کے بیانات، منطق، عقل، اور ممتاز صحابہ کرام کی پاکیزہ زندگیاں جن پر قرآن مجید کی مہرِ ثبت ہے سے مناسبت نہیں رکھتے۔ اس لیے ان واقعات کو قبول کرنے کے لیے انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہماری رائے یہ ہے کہ ممتاز صحابہؓ کے بلند کردار کے بارے میں قرآن مجید کے صاف اور واضح بیانات ہماری نگاہ سے اوجھل نہیں رہنے چاہئیں، ان سارے واقعات کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اظہارِ رائے پر پابندی نہیں لگائی البتہ لب و لہجہ کی تندی و تلخی کو اگر انھوں نے ناپسند کیا ہو تو اور بات ہے حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کا مختصر دورِ خلافت باہمی جھگڑوں کی نذر ہو گیا انھوں نے حق و انصاف کے قیام کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور کسی شہری کی آزادی کو سلب نہیں کیا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے حضرت حسنؓ امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ عام مسلمانوں نے اس بات پر خوشی منائی کہ مسلمانوں میں خونریزی بند ہوئی اور اس سال کو "عام الجماعۃ" یعنی وحدت کا سال قرار دیا لیکن صاحبِ نظر لوگوں نے اس سال کو بقول جاحظ "عام فرقہ و قہر" سے تعبیر کیا (یعنی انتشار اور جبر و قہر کا سال) کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک شورائی نظام کو جو عدل و انصاف، انتخاب اور رائے کے آزادانہ اظہار پر قائم کیا گیا تھا ختم کر کے ایک نئے سیاسی نظام کا آغاز ہوا تھا جس میں آزادیٔ رائے کی بجائے تلوار نے بنیادی کردار کیا۔

آج مسلمانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے اور شاید درست کیا جاتا ہے کہ مسلم سوسائٹی میں آزادیٔ فکر یا یوں کہیے اظہارِ رائے کی آزادی نہیں ہے مسلمانوں نے اپنی صفوں میں اختلافِ رائے کو بڑی بے دردی سے نکال باہر کیا ہے مغرب کے بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو پر جو جمود اور سکون چھایا ہوا ہے اس کی ذمہ داری خود اسلام پر ہے۔ جن لوگوں نے ہماری پسماندگی کی وجہ اسلام کو قرار دیا ہے یہاں ان سے بحث مطلوب نہیں۔ کیونکہ گذشتہ صفحات میں تاریخ کی روشنی میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام نے عقیدے کی آزادی کا اعلان کر کے انسانی وقار کو بحال کرنے میں زبردست کردار ادا کیا ہے لیکن یہ حقیقت بھی شبہ سے بالاتر ہے کہ آج مسلمان زندگی کی دوڑ میں دوسری قوموں سے پیچھے ہیں اس کے جو بھی وجوہ ہوں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمان اپنی صفوں میں آزادیٔ رائے یا اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کرتے جس کی وجہ سے مسلم دنیا میں مذہب، سیاست، سائنس، اخلاق کی صحت مند قدروں نے کوئی فروغ نہیں پایا۔ یہ صورتِ حال کیوں پیش آئی؟ اور اپنی ہی اسلامی روایات کے برعکس اظہارِ رائے کی آزادی کو کیوں تسلیم نہیں کیا گیا؟ یہ سوال آج ان گنت لوگوں کا موضوعِ سخن ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد بنو امیہ نے تلوار کے بل پر اقتدار پر قبضہ حاصل کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی [illegible] میں سیاست، تغلب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا شوریٰ کے بجائے طاقت کی تاکی تھی دوسرے یہ کہ صدر ریاست صرف سیاسی زندگی کا ترجمان ہوتا تھا۔

خلافت راشدہ اور بنو امیہ کی حکومت کے فرق کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسولِ کریمؐ کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ پہلے خلیفہ چُنے گئے تو آپ نے کہا "لوگو! میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں، میری خواہش تھی کہ ریاست کی ذمہ داری کوئی اور شخص سنبھالتا۔ بہر نوع اگر میں سیدھی راہ پر چلوں تو تم میری پیروی کرو۔ اور اگر مجھ میں کوئی کجی دیکھو تو مجھے سیدھا کر دو۔" یہ تھی حضرت ابوبکرؓ کی پہلی تقریر جو انہوں نے صدر ریاست کی حیثیت سے کی لیکن نئے دور میں جب امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا تو ملک کے مختلف حصوں سے لوگوں کے وفد آئے، تقریریں کی گئیں۔ ان تقریروں میں ایک صاحب نے کہا "لوگو! یہ ہیں امیر معاویہؓ جو تمہارے حاکم ہیں اگر وفات پا جائیں تو پھر یہ یزید ہے اور اگر کوئی اس کا انکار کرے تو پھر یہ تلوار ہے۔" اس محفل میں عرب کا مشہور اولوالعزم اور بہادر رہنما احنف بن قیس بیٹھا تھا۔ امیر معاویہ نے اس سے کہا کہ احنف تم خاموش کیوں ہو؟ احنف نے جواب میں کہا کہ اگر میں سچ کہتا ہوں تو آپ سے ڈرتا ہوں اور اگر جھوٹ بولتا ہوں تو خدا سے، اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔ ان دونوں واقعات میں جو فرق ہے۔ اس پر مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔

یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ جب اقتدار اور حکومت طاقت اور تلوار کے بل پر حاصل کی جاتی ہے تو پھر حکمران گروہ سیاسی زندگی میں کوئی اختلاف برداشت نہیں کرتا۔ ایسی حکومت میں آزادیٔ رائے یا اس کا اظہار جرم قرار دیا جاتا ہے چنانچہ بنو امیہ نے یہی راہ اختیار کی۔ یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ بنو امیہ کے حکام پوری طرح سے جابر اور ڈکٹیٹر قسم کے بادشاہ نہیں تھے۔ ان کے دربار میں آزاد منش عرب بعض اوقات تند و تیز باتیں بھی کر جاتے تھے جن کو امیر معاویہ نہایت ہی بردباری اور تحمل سے سن لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی تک حکمران خاندان میں عربوں کی صحرائی زندگی کی اچھی صفات موجود تھیں لیکن بنو امیہ کے بعد جن خاندانوں نے حکومت پر قبضہ کیا انھوں نے اسلامی تاریخ میں آزادیٔ رائے کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ البتہ مذہبی باتوں میں یا فکر و نظر کے بعض گوشوں میں آزادی تھی۔ سیاسی آزادی کو کس حد تک دبایا گیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ یونان کے فکری سرمایہ کی حفاظت عربوں نے کی۔ افلاطون اور ارسطو کے کام کو عربوں نے عربی زبان میں منتقل کر کے یورپ کے حوالے کر دیا۔ عربوں نے یونانی مفکر، ارسطو کو معلّم کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لقب دیا لیکن یونان سے اس سارے تعلق اور عقیدت کے باوجود عربوں نے نہ تو افلاطون کی "جمہوریت" (Republic) کا اور نہ ہی ارسطو کی "سیاست" (Politics). کا ترجمہ کیا۔ بنو امیہ حکومت کے خلاف جو بھی سیاسی جماعت اٹھی، بنو امیہ نے اس سے جنگ کی۔ بنو امیہ کے دور میں خارجی اور شیعہ دو ہی سیاسی پارٹیاں تھیں۔ خارجیوں کا کہنا یہ تھا کہ حکومت پر صرف قریش ہی نہیں بلکہ تمام عرب مسلمانوں کا حق ہے، خارجی عقیدے کے ساتھ ساتھ عمل پر بھی زور دیتے تھے اور اسلام کے ظاہری احکام کی بڑی شدت سے پابندی کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے حکمران خاندان کے سیاسی استبداد کے خلاف مسلسل جنگ جاری رکھی۔ خارجی جماعت کے علاوہ شیعہ جماعت تھی جو حکومت کو حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا حق تصور کرتے تھے۔

ان دونوں سیاسی جماعتوں کے علاوہ بنو امیہ نے مذہبی جماعتوں کو کچھ نہیں کہا۔ چنانچہ اس دور میں مرجئہ اور معتزلہ نام سے دو مذہبی جماعتیں وجود میں آئیں اور اسلام میں نئی نئی بحثیں کیں۔ حکمران خاندان نے ان مذہبی بحثوں سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ مثلاً معتزلہ برائی اور بھلائی کا معیار عقل کو گردانتے تھے نیز یہ بھی کہتے تھے کہ انسان اپنی تقدیر اور اپنے افعال اچھے ہوں یا برے۔ کا خود خالق ہے۔ معتزلہ جماعت کا بانی واصل بن عطاء تھا جو اسلامی تاریخ کی ایک ممتاز و منفرد شخصیت حسن بصری کا شاگرد تھا۔ معتزلہ کے برعکس مرجئہ کا کہنا یہ تھا کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، ایمان ہے تو سب کچھ ہے۔ امام ابو حنیفہ جیسے بلند مقام آدمی بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ حکومت نے مسلمانوں کو جو مذہبی آزادی دی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حکمران خاندان نے سرکاری طور پر کسی خاص مذہبی نقطہ نظر کو اپنی پالیسی قرار نہیں دیا تھا لیکن جب آٹھویں صدی میں اموی خاندان کا تختہ الٹ گیا اور عباسی خاندان نے قبضہ کیا تو انھوں نے اپنے آپ کو مذہب کا بھی ترجمان قرار دیا۔ جس کا نقصان یہ ہوا کہ سیاسی امور کے ساتھ ساتھ مذہبی امور میں بھی مسلمانوں کی آزادیٔ رائے پر پابندی لگا دی گئی۔ مثلاً عباسی خاندان کے تیسرے حکمران مہدی نے مذہب کے نام پر بیسیوں آدمیوں کو یہ کہہ کر قتل کرایا کہ وہ زندیق ہیں۔ زندیق کا کیا مطلب ہے اس کے بارے میں کوئی ایک رائے نہیں ہے۔ ہر آزاد خیال آدمی کو زندیق کہا جاتا تھا یا جس آدمی نے ترنگ میں آ کر اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہوئے ہنسی مزاح میں شیخ کا ذکر کر دیا اسے بھی زندیق کہا گیا۔ ایسے ہی لوگ خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھتے تھے انھیں بھی زندیق قرار دیا گیا۔ غرضیکہ یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کی آڑ میں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا۔ چنانچہ جب کسی آدمی نے اپنے مخالف سے بدلہ لینا چاہا اس نے اسے زندیق کے نام سے بدنام کیا اور قتل کرا دیا۔ بشار بن برد بھی ایک ممتاز لیکن بدنصیب شاعر تھا جس کی زبان سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شریف لوگ ڈرتے تھے لیکن حکومت نے اسے کبھی کچھ نہ کہا۔ ایک دفعہ بشار نے حسبِ عادت اپنے وقت کے وزیر یعقوب بن داود کی مذمت میں چند شعر کہہ دیے۔ یعقوب حکومت میں سیاہ سپید کا مالک تھا اور خلیفہ مہدی پر چھایا ہوا تھا۔ بشار نے کہا تھا کہ اگر دودھ دینے والی گائے دودھ نہ دے تو گائے کے بجائے دودھ دہنے والا قصوروار ہے۔ مطلب یہ تھا کہ مہدی کے جود و کرم کی راہ میں وزیر رکاوٹ بنا ہوا ہے اس نے مزید کہا: امیہ کے بیٹو! قبروں سے اٹھو! تم بہت سو چکے ہو۔ اب یعقوب بن داود خلیفہ بن گیا ہے۔ اے قوم! اب تیری حکومت برباد ہو گئی کیونکہ تمہارا خلیفہ یعنی مہدی صراحی اور ساز کے پاس بیٹھا ہوا ہے"۔ وزیر نے اسی سالہ بوڑھے شاعر پر زندیق کا الزام لگا کر اسے قتل کرا دیا۔ لیکن بشار کی موت کے بعد اس کے پرائیویٹ کاغذات سے یہ پتہ چلا کہ اس نے اپنے ایک مخالف کی صرف اس لیے مذمت نہیں کی تھی کہ اس کا تعلق رسولِ کریمؐ کے خاندان سے تھا۔ مہدی کو خود اس پر ندامت ہوئی اور پر نم آنکھوں سے کہا کہ اب ندامت کا کوئی فائدہ نہیں۔

ایک اور واقعہ سن لیجئے ابنِ مقفع اپنے وقت کا باکمال آدمی تھا اس کی بلند نظری، نفاست، شرافت اور علم و فضل کا دور دور تک شہرہ تھا۔ حاجت مندوں کے کام آتا۔ بصرہ میں اس نے پانچ سو سے لے کر دو ہزار آدمیوں کے وظائف لگا رکھے تھے۔ وہ مسلم معاشرے میں ایک ہی قانون دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے مسلم سوسائٹی کی اصلاح، وحدت اور ترقی کے لیے عباسی حکمران منصور کو جو تجویزیں پیش کی تھیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتنا بڑا مدبر اور سکالر تھا لیکن اس کے ایک مخالف سفیان بن معاویہ نے خود منصور کے ایما پر اسے زندیق کی تہمت میں قتل کرا دیا لیکن منصور نے قاتل کو کچھ نہیں کہا۔ بات دراصل یہ تھی کہ ابنِ مقفع نے ایک دفعہ منصور اور اس کے حریف کے درمیان ایک معاہدہ لکھا تھا۔ یہ معاہدہ اس احتیاط اور دور اندیشی سے لکھا گیا تھا کہ منصور کے سامنے نقضِ عہد کی تمام راہیں بند کر دی گئی تھیں۔ سفیان بن معاویہ خود بھی ابن مقفع سے ناراض تھا۔ یہ امر بھی ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ابن مقفع نے بڑے خوبصورت انداز میں سیاسی استبداد اور ڈکٹیٹرشپ کی مذمت کی تھی۔ اس نے قدیم ہندوستان کی مشہور کتاب کلیلہ و دمنہ کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب میں جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں اور ان کی زبانی ظلم و ستم کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ کتاب آج بھی موجود ہے۔

ہم یہاں مزید [illegible] تاریخی اور ادبی کتابوں مثلاً طبری، [illegible] کامل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اورا غانی میں اس سلسلہ میں جو واقعات درج ہیں ان کو پڑھنے کے لیے دل گردے کی ضرورت ہے۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ طاقت کے بل پر برسرِ اقتدار آنے والا حکمران گروہ اپنے سیاسی مفاد کے لیے مذہب کا لبادہ اوڑھ کر انسانوں کا خون گرانے میں کس قدر بے رحم واقع ہوا تھا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسلام کی پہلی صدی کے بعد سیاسی امور میں اظہارِ رائے کو بڑی سختی سے کچلا گیا اور آگے چل کر مذہبی آزادی پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ اس نئی مذہبی پالیسی کی زد میں امام حنبلؒ جیسا امام کبیر بھی آیا۔ جب مامون نے خلق قرآن کے نظریہ کو بزور لوگوں پر ٹھونسنا چاہا۔ تو امام بن حنبل نے اس کی سخت مخالفت کی۔ امام کو جس ابتلا سے گذرنا پڑا اور جس انداز سے اپنے موقف پر ڈٹے رہے وہ ہماری تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ مامون اگر اپنے طور پر قرآن مجید کے مخلوق ہونے پر یقین رکھتا تو شاید ابن حنبلؒ کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن جب اس نے اس نظریہ کو بزور رائج کرنا چاہا تو امام نے کہا کہ میں اپنی رائے کہ قرآن غیر مخلوق ہے، سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں مامون کو اپنی رائے کی تائید میں تلوار نہیں دلیل کا سہارا لینا چاہیے۔ یہ پابندی دو طرف سے آئی، حکمران گروہ کی طرف سے اور اس کی حمایت کرنے والے مذہبی علماء کی طرف سے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ سیاسی اور مذہبی استبداد کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود تھا۔ جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق تھا۔ ان کی مذہبی آزادی پر عمومی طور پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ ان پر اگر کسی حکمران نے ناروا سختی کی تو اسے مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقہ نے پسند نہیں کیا اور اس قسم کے ظالمانہ رویہ کو بری نگاہوں سے دیکھا لیکن خود مسلمانوں نے آپس میں نکری، مذہبی اور نظری مسائل میں بھی رواداری، وسعتِ نظر اور تحمل و بردباری کا ثبوت نہیں دیا۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے حکمران گروہ کے افسوسناک رویہ کے باوجود قرونِ وسطیٰ میں صوفیہ کا گروہ ایک ایسا گروہ تھا جس کے حلقوں میں انسان کی عزت اور وقار محفوظ تھا۔ صوفیہ نے مذہب کی روح سے سرشار ہو کر عقیدے، رنگ اور ذات پات کا خیال کئے بغیر انسان کی خدمت کو اپنا شعار بنایا اور مایوس انسان کے دل میں امید اور ڈھارس کے دیئے جلائے۔ شیخ سعدیؒ نے انسان کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لیے لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک سو سالہ بوڑھے آدمی کو بڑے ہی تپاک سے اپنا مہمان بنایا۔ لیکن جب دسترخوان پر بوڑھے نے اللہ کا نام لیے بغیر کھانا شروع کیا۔ تو ابراہیم کو دکھ ہوا اور پتہ چلا کہ بوڑھا مہمان آتش پرست ہے۔ ابراہیم نے بوڑھے کو گھر سے باہر نکال دیا لیکن اس کے فوراً ہی بعد ابراہیم کو خدا کی طرف سے سرزنش کی گئی کہ ہم نے بوڑھے کو سو سال تک نوازا لیکن تم اسے ایک وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا کھانا نہیں کھلا سکے۔

اس واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ اسلام نے صوفیہ کے دلوں کو اسلام کی بلند اخلاقی قدروں کا کتنا حسین تصور دیا ہے لیکن حکمران گروہ اور اس کے ہم خیال علماء کے طبقے نے اپنی خود پرستیوں کا نام مذہب قرار دیا تھا۔

حقیقت یوں ہے کہ اظہار رائے کی آزادی کا چھیننا استبدادی حکومت کا ایک فطری تقاضا ہے۔ چنانچہ جب مسلمان سوسائٹی کو اس خوفناک صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تو بے بس اصحابِ نظر نے بلند اخلاقی قدروں کی تلقین کی اور ظالم بادشاہوں کے عبرت ناک انجام کو بڑے ہی موثر انداز میں نثر و نظم میں بیان کیا جس سے مقصد یہ تھا کہ یہ جابر بادشاہ عقل و دانش کی راہ اختیار کریں۔ فارسی میں شیخ سعدی اور عربی زبان میں ابن مقفع کی تحریریں ایسی کتابیں ہیں جو سیاسی استبداد کے خلاف ایک حسین احتجاج ہیں۔ ایسے ہی تاریخ اسلام کے مایہ ناز فلسفی ابو نصر فارابی نے مثالی معاشرے کے قیام کے لیے اپنی مشہور کتاب "المدینۃ الفاضلہ" لکھی۔ یہ کتاب دراصل افلاطون کی "جمہوریت" کا خوب صورت عکس ہے۔ عہد حاضر میں دستوری حکومت، اظہار رائے کی آزادی کی حمایت میں جمال الدین افغانی نے آواز بلند کی، لیکن سامراج اور اس کے ساتھیوں نے افغانی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔

ان انفرادی کوششوں کے باوجود مسلم سوسائٹی نے اس طویل تاریخ میں سیاسی طور پر کوئی ایسا انقلابی قدم نہیں اٹھایا جو ہر شہری کو ایک باوقار اور پر امید زندگی عطا کرتا۔ اس لیے آج مسلم سوسائٹی میں عمومی طور پر اظہارِ رائے کی آزادی نہیں ہے تو یہ کوئی نیا مرض نہیں ہے یہ ایک پرانا مرض ہے جس نے مسلم سوسائٹی کے سماجی، اقتصادی، سیاسی اور روحانی نظام کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اگر آج ہم ایک صحت مند اور باوقار قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی سیاسی، اجتماعی اور مذہبی خامیوں کا گہری نظر سے جائزہ لینا ہوگا۔ آج ہم مسلم سوسائٹی میں جو انتشار اور بدنظمی دیکھ رہے ہیں یہ دراصل بقول افلاطون ہمارے اپنے ذہن کی پریشانی کا ایک عکس ہے جسے ہم خارج میں دیکھ رہے ہیں اور جب تک ہم اظہار رائے کی آزادی کو عملی طور پر پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں دیں گے اس وقت تک ہمارے قدم سیدھی سمت پر نہیں اٹھ پائیں گے۔

مسرت کا مقام ہے کہ ہم نے پاکستان میں اصولی طور پر اظہار رائے کی آزادی کو تسلیم کر لیا ہے اور ایسے ہی جمہوریت اور انتخاب کو اپنے اجتماعی نظام کی بنیاد قرار دیا ہے ایسا کر کے ہم نے دراصل اپنے ہی بھولے ہوئے سبق کو دہرایا ہے۔ چنانچہ اگر ہم باوقار، سنجیدہ اور مہذب انداز سے اظہار رائے کی آزادی کے حق کو استعمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے رہے تو ہم یقیناً اس بحران پر قابو پانے میں کامیاب رہیں گے جس سے آج ہماری اجتماعی اور اخلاقی روح دوچار ہے۔

ماخذ

1. Plato. ED, R. W. Livingstone Oxford.
2. Bury. a History of Freedom of Thought, London.
3. Muir. William, the Caliphat, Edirburgh.

۴۔ احمد امین ، ضحی الاسلام جلد ۱ قاہرہ — فجر الاسلام قاہرہ

۵۔ جہشیاری کتاب الوزراء (تحقیق مصطفی السقا)۔

۶۔ رسائل الجاحظ ، مرتبہ السندوبی ، قاہرہ۔

۷۔ کتاب الاغانی (ترجمہ بشار بن برد)، مطبوعہ دارالکتب، مصر

۸۔ الکامل للمبرد ۔ قاہرہ

© rasailojaraid.com